© rasailojaraid.com

عباد اللہ فاروقی مرحوم

اقبال کے قرآنی تصوّرات

خودشناسی میں کمالِ انسانی

اقبال کے فلسفۂ حیات کا سنگ بنیاد اثباتِ خودی میں مضمر ہے۔اس کے نزدیک کائنات مدرکہ کی اعلیٰ ترین قدر و قیمت فرد کے شعورِ ذات میں پوشیدہ ہے۔اگر اقبال کے فلسفۂ خودی کے سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیں تو ہمیں خالص اسلامی روایات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔قرآن کریم میں انسان کی انفرادی شخصیت کی فضیلت اور عظمت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ذات باری تعالےٰ کا فرشتوں کو یہ حکم کہ آدم کو سجدہ کرو محض استعارہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک زبردست حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔یعنی یہ کہ انسان کا شخصی وجود کس قدر احترام کا مستحق ہے۔قرآن میں ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم. ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْن. اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَات۔

یعنی انسان فی الحقیقت نیک نہاد ہے اور اس کی شرافت و فضیلت مسلّم ہے لیکن بُرے اعمال کی وجہ سے اس کا ازلی کمال زائل ہوسکتا ہے۔شر انسانی وجود کے ساتھ لازمی نہیں بلکہ انسان اپنے اعمال کا مختار ہے۔قرآن حکیم میں لیس للانسان الا ما سعیٰ اور لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت کہہ کر ہر فرد کی اخلاقی ذمہ داری مکمل طور پر متعین کردی گئی اور اس کے اعمال کو تشکیل حیات کا ذمہ دار ٹھہرایا۔اقبال نے اپنے ایک لیکچر میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیہ کریمہ انا عرضنا الامانتہ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقنا منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولاً کی یہ تفسیر کی ہے کہ جس امانت کا بوجھ آسمان اور زمین نے اٹھانے سے انکار کیا وہ شخصیت اور احساس ذات کی ذمہ داری تھی جسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان نے جوشِ وجدان میں قبول کر لیا اور اس سے اس کی ساری فضیلت پیدا ہوئی[1] اور اسی کی بدولت اس نے نظامِ عالم کو تسخیر کیا۔ پہاڑوں کے سینے چاک کئے اور ویرانوں کو آباد کیا اور اپنے وجود کا سکّہ کائناتِ فطرت کے ہر گوشہ پر بٹھا دیا۔

غرض اقبال کے پیغام کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کا اخلاقی نصب العین اثباتِ خودی میں مضمر ہے۔ انسان کی شخصیت اور فرد کا وجود، حیات کا واحد اور کافی بالذات مرکز ہے۔ زندگی کا اصل محرّک احساسِ ذات ہے زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے جو نت نئی خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے اور اسی طرح اپنی توسیع اور بقاء کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ خودی کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ فطرت ہے جس پر غلبہ پانا ضروری ہے۔ فطرت پر غلبہ پانے کے لئے سخت کوشی کی ضرورت ہے۔ اقبال کے نزدیک سخت کوشی ایک قانونِ فطرت ہے سخت سخت کوشی دنیا کے ہر فرد اور ہر قوم کی بنائے حیات ہے۔ اسے اختیار کئے بغیر نہ تو کوئی فرد عزت و آبرو سے اپنے حقوق زندگی حاصل کر سکتا ہے نہ کوئی ملّت۔ بالفاظِ دیگر سخت کوشی حفظ و بقائے خودی اور زندگی کی عظمت و سطوت اور قوّت و جبروت کے لئے لازمی شے ہے۔ یہ ایک ایسا مستقل آئینِ قدرت اور اسلوبِ فطرت ہے کہ جب تک فرد و ملّت پوری دلچسپی اور ذمّہ داری سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ وہ اپنی عزت و آبرو حقوقِ حیات اور "انا" کے محافظ ہیں لیکن جونہی وہ اس سے غفلت و اغماض برتیں وہ عبرتناک طریق پر زوال پذیر بلکہ کالعدم ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کی طرف جا بجا اشارہ کیا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی کبد (پ ۳۰، ع ۱۵)

ہم نے انسان کو محنت اور مشقت کے لئے پیدا کیا ہے۔

وان لیس للانسان الا ما سعیٰ ۝ وان سعیہ سوف یریٰ ۝ ثم یجزٰیہ الجزاء الاوفیٰ ۝

(پ ۲۷، ع ۷)

---

[1] مولانا روم کے نزدیک انسانی عظمت و شرف کا سبب نورِ حق ہے یا لطفِ الٰہیہ ہے۔ اسی سبب سے انسان مسجودِ ملائکہ رہا۔ فرماتے ہیں ؎

گر نبودے نورِ حق اندر وجود

آدمی را کے ملک کردے سجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان صرف اپنی سعی و محنت ہی کا ثمرہ پائے گا (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)، اس کی جدوجہد کی جزا اسے دکھائی جائے گی۔ پھر اس کو اس کے نیک اعمال کا پورا پورا معاوضہ عطا کیا جائے گا۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (پ ۱۳، ع ۸)

اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت کو ہرگز نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کرے۔

اسی بنا پر علامہ ضرب کلیم میں فرماتے ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل "نہ جل ترنگ"

جاوید نامہ میں فرماتے ہیں ؎

زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
اے خنک موجے کہ از ساحل گزشت

اقبال کے نزدیک جو چیز خودی کو مستحکم کرتی ہے وہ خیر ہے اور جو اس کو ضعیف کرے وہ شر ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے۔ اقبال عشق کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے اور اکثر اوقات اس کو عقل کا مدِ مقابل بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے ابتدا میں فرماتے ہیں۔

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است
گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

لیکن عام طور پر عشق سے اقبال کی مراد وہ وجدانی جوش ہے جو تکمیلِ ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے اور مواقع پر قابو پاتا ہے۔ اس کی بدولت ایمان کی قوت پیدا ہوتی ہے جس کے آگے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔

عشق کا ایک اور خاصہ پیہم آرزو ہے اور اسی کے باعث انسان کو فرشتوں پر فضیلت ملی ہے۔

© rasailojaraid.com

اقبال عشق سے فطرت کی تسخیر کا کام لیتا ہے۔ اس کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ

© rasailojaraid.com

کے سامنے جبریل کو صید زبوں سمجھنے لگتا ہے اور اپنے وجدان کی کمند سے یزداں کو شکار کرنے کے منصوبے سوچتا ہے۔ ؎

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

مختصر یہ کہ اقبال کے نزدیک فرد کا وجود زندگی کا مستقل بالذات مرکز ہے۔ وہ اثباتِ خودی کے ذریعہ جذب و تسخیر کی تخلیقی قوتیں بروئے کار لاسکتا ہے۔ انسان خالق ہے۔ اقبال اس کے ثبات میں قرآن مجید کی یہ آیہ کریمہ "فتبارك الله احسن الخالقين" (یعنی مبارک ہے خدا خالقوں میں سب سے بہتر) سے بھی سند لاتا ہے۔

اقبال جاوید نامہ میں اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

زندگی ہم فانی و ہم باقی است ۔۔۔ ایں ہمہ خلاّقی و مشتاقی است !
زندہ ؟ مشتاق شو خلاق شو ۔۔۔ ہم چو ما گیرندہ آفاق شو !
ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست ۔۔۔ پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

اور پھر پیامِ مشرق میں انسان اپنی بے پناہ قوتِ تخلیق کی وجہ سے خدا کو بھی چیلنج کرتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ۔۔۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی ۔۔۔ خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم ۔۔۔ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غرض انسان کی زندگی کا سفر مثل ایک تخلیقی بہاؤ کے ہے جس کی صورت یہ ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

شعورِ ذات خودی کی خالص شان ہے اور یہی انسانی آزادی کی بنیاد اور خودی کی یکتائی کا موجب ہے۔ انسانی شعور فطری عمل دمر دو ہی سے ماورا نہیں ہے بلکہ خود اپنی ذات سے ماورا ہے۔ اس لئے اس کے تجربوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسلام نے خودی کی آزادی کو عبدیت سے محدود کیا ہے کہ بغیر اس کے اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعمیری صلاحیتیں بروئے کار نہیں آسکتیں اور اس کا حقیقی نشوونما نہیں ہوسکتا تاکہ وہ تاریخ کی قوتوں اور فطری میلانوں کا مقابلہ کرسکے اور ان پر قابو پاسکے۔ عبدیت ہی سے خودی کا تحفظ ممکن ہے۔ باطنیت میں یا تو خودی خدا بننے کا دعوی کرتی ہے یا پھر بے امتیاز ابدیت میں ضم ہو جاتی ہے اور اس کا علیحدہ وجود نہیں رہتا۔ خودی کا اسلامی تصور یہ ہے کہ فرد مخلوق ہے۔ جس کی ذات میں ذاتِ باری تعالیٰ نے بے انتہا امکانات پوشیدہ رکھے ہیں جو سب کے سب زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے۔

اقبال نے خودی کی توسیع و بقا کو اپنے فلسفۂ تمدن کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اُخروی زندگی میں ارتقائے خودی کا سلسلہ بدستور قائم رہے گا۔ علامہ کے اس تصور کی بنیاد بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔

ان الاخرۃ لھی الحیوان

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

لا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (سجدہ ع ۲) (کوئی شخص نہیں جانتا جو عیش و نشاط پنہاں آگے ملنے والا ہے)

اس ضمن میں اقبال کا ایک شعر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ؎

گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمے دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گلِ تر است

"لینن خدا کے حضور میں" اقبال کی مشہور نظم ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار میں لینن کے انکارِ خدا و آخرت کا ذکر اس کی اپنی زبان سے ہو رہا ہے۔ وہ عالمِ آخرت کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہتا ہے ؎

آج آنکھ سے دیکھا تو عالم ہوا اثبات
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

یعنی میں جس عقیدے کو زندگی بھر مذہب کی بیہودگی سمجھتا رہا، آج موت کے بعد اس کا وقوع اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس شعر میں اقبال کا اشارہ مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ کی طرف ہے۔

لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔
(ق - ع ۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(تو اس غفلت میں پڑا ہوا تھا، سو اب ہم نے تجھ سے تیرا پردۂ غفلت دور کر دیا۔ پس آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔)

اقبال ساقی نامہ میں ان لوگوں کو نادان کہتے ہیں جو حیاتِ آخروی کے قائل نہیں ؎

سمجھتے ہیں نادان اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

اقبال حیاتِ ارضی کو خودی کی منزلِ اوّلین قرار دیتے ہیں ؎

یہ عالم یہ بُت خانہ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا

خودی فانی ہے لیکن عمل سے لازوال بن سکتی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان ممکن الوجود ہے اس کا وجود ذاتِ حق کے سہارے قائم ہے جو قائم بالذات ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خودی را از وجودِ حق وجودے — خودی را از نمودِ حق نمودے
نمے دانم کہ ایں تابندہ گوھر — کجا بود اگر دریا نبودے

واجب الوجود کی شان یہ ہے۔ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اصدق کلمۃ قال الشاعر قول لبید ء الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل۔ سچا کلمہ جو شاعر لبیدؔ نے کہا ہے وہ لبیدؔ کا یہ قول ہے۔ سن لو جو شے ماسوا اللہ ہے وہ باطل ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغِ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بُتان وہم و گمان لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ

خرد ہوتی ہے زمان و مکان کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

کل شی ھالک الا وجھہ (اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا تمام اشیاء فانی ہیں)

کل من علیھا فان و یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

انک میت و انھم میتون (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو اور وہ سب میت ہیں اور معدوم

یہاں اللہ تعالیٰ مخلوق کی حقیقت اور ماہیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تم اور تمہارے علاوہ جس طرح پہلے عدم میں تھے، اب ہی عدم کے لئے ہیں۔ ممکن کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دو عدموں کے درمیان ہوتا ہے۔

اقبال ساقی نامہ میں فرماتے ہیں ؎

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے ہوئی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

اقبال فرماتے ہیں جس طرح ایک فرد احساسِ ذات، ارادہ اور حافظہ کے ذریعہ سے اپنی ذات کی گہرائیوں کی تہ تک پہنچتا ہے، اسی طرح قومیں اور جماعتیں اپنی تاریخ کے ذریعہ سے اپنی اجتماعی خودی کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستحکم کرتی ہیں۔ تاریخ کی بدولت ماضی وحال کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور قوم کا وجود تجرید کی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

تاریخ کو قرآن نے ایام الٰہی سے تعبیر کیا ہے جو انفس و آفاق کے علاوہ انسانی علم کا ماخذ ہے چنانچہ آیہ کریمہ میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم
(کیا انہوں نے ملکوں کی سیر نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں)

اقبال نے اپنا تصورِ تاریخ مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔

چیست تاریخ اے زخود بیگانہ — داستانے قصۂ افسانہ ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند — آشنائے کار و مردِ رہ کند
رُوح را سرمایۂ تاب است ایں — جسم ملّت را چو اعصاب است ایں
شعلۂ افسردہ در سوزش نگر — دوش در آغوشِ امروزش نگر
شمع اُو بخت امم را کوکب است — روشن از وے امشب و ہم دیشب است
بادہ صد سالہ در مینائے او — مستی پارینہ در صہبائے او

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

قوم روشن از سوادِ سرگزشت
خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
سرگزشت اُو گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم مے شود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کے نزدیک کسی قوم کی تاریخ ہی اس کے مسائل اجتماعی کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ تاریخ واقعات و حوادث کا بے معنی انبار نہیں۔ نہ اس کو قصہ کہانی سمجھ کر پڑھنا چاہیئے، بلکہ حقیقت میں وہ ذریعہ ہے جماعت کی سیرت کو قوی بنانے اور اس کو آمادۂ عمل کرنے کا۔ تاریخ عالم ایک مسلسل تخلیقی حرکت ہے جو گروہ اپنے تئیں اس تخلیقی رَو کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں، وہ سرفراز ہوتے ہیں اور جو اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، پستی میں پڑ جاتے ہیں۔

ملّتِ بیضا کے ربط و تنظیم کے بنیادی اصول عقیدہ توحید و رسالت ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق جو اسلامی تہذیب وجود میں آئی وہ اقبال کے نزدیک اجتماعی زندگی کے لئے بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک طرف تو فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اور دوسری جانب اس میں روحانیت اور مادّیت دونوں کا اس خوبی سے امتزاج کیا گیا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں لازوال قوتِ حیات پیدا ہو گئی ہے اور اس میں فطرت نے ایسی صلاحیت ودیعت کر دی ہے کہ وہ گر گر کر اٹھ سکتی ہے اور پست ہو کر سربلند ہو سکتی ہے۔ اس کی مثالیں تاریخِ اسلام کے ہر ورق پر مل سکتی ہیں۔

اقبال کی رائے میں جب کسی جماعت سے قومی عصبیت اور احساسِ ذات فنا ہو جاتا ہے تو وہ کسی دوسری جماعت میں جو ان سے زیادہ جاندار اور قوی سیرت کی مالک ہوتی ہے مدغم ہو جاتی ہے یا غلام بن جاتی ہے تاکہ دوسرے محنت کر کے اس کی حفاظت کریں اور وہ خود ان کے زیر سایہ آسائش کی زندگی گزاریں۔ اس چیز کو اقبال نے "مسلک گوسفندی" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر شیر یہ چاہے کہ وہ بکری بن جائے اور زندہ رہے تو یہ ناممکن ہے، یہ چیز خود قصاب کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ بکری کی موجودگی میں خود بھوکا رہے اور بکری کو ذبح کر کے نہ کھائے۔

اقبال کے نزدیک زندگی ایک پیہم کش مکش ہے۔ یہ جنگ ہر لمحہ اور ہر لحظہ برپا ہے۔ ابتدا میں یہ کش مکش جمود اور حرکت کے درمیان ہے۔ انسان میں یہی جنگ نئی اصطلاحات اختیار کرتی ہے اور معرکۂ حق و باطل کہلاتی ہے۔ حق کی انفرادی فتح کی صورت میں مردِ حق ظاہر ہوتا ہے اور حق کی عالمگیر فتح سے حکومتِ الٰہی ظہور میں آتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاقِ انسانی کی اصل بنیاد

انسان ایک آزاد اور با اختیار شخصیت ہے۔ لہٰذا اپنے افعال و کردار کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بقول علامہ آگہی اور شعور کے جوہر نے اس کو آزادی دی۔ وہ اب پہلے کی طرح مجبور محض نہ رہا بلکہ کائنات کا مرکزی نقطہ بن گیا، جس کی نمود پر انجم بھی سجدہ میں گر پڑے ؎

برخیز کہ آدم را ھنگامۂ نمود آمد
این مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد[1]

وہ کائنات کا اصل معنی بن گیا۔ جس کی تلاش میں رنگ و بو کے قافلے نکلے ہوئے ہیں ؎

آیۂ کائنات کا ہے معنیٔ دیر یاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو[2]

ہستی کے اس مخفی راز کا پتہ شوخیِ آب و گل سے پوچھیے ؎

آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود
از شوخیِ آب و گل در گفت و شنود آمد[3]

لیکن حضرت انسان جسکے سامنے زمین و آسمان کی تمام چیزیں مسخر کر دی گئیں ایک برتر اور اعلیٰ ذات کے سامنے جھکتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ خدائے ارض و سمٰوٰت ہی نے کائنات کی جملہ اشیاء کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

انسان جب کائنات کی تسخیر کرتا ہے تو اپنے رب کی نعمتوں کو نہیں بھولتا، بلکہ قربِ حق حاصل کرنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتا ہے۔

لِتستوٗا علےٰ ظھورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ وتقولوا سبحٰن الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الیٰ

---

[1]، [3] زبورِ عجم ص ۸۹

[2] بالِ جبریل ص ۱۵۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ربنا لمنقلبون (۴۲/۱۴/۴۲)

"جب اس پر جم چکو تو اپنے رب کی نعمتوں کو دل سے یاد کرو۔ استعجاباً یوں کہو کہ اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو کر لیتے۔ ہم کو اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے"۔

مومن کی اس شان کو علامہ نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے ؎

تابع حق دیدنش نادیدنش
خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار[1]

مسلمان انفس و آفاق دونوں کی تسخیر کرتا ہے لیکن ان قوتوں کو وہ اپنی مرضی کے مطابق کام میں لانے کی بجائے احکامِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے اور اس طرح شرف انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ اخلاقی نظام کا تصور اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہماری زندگی کا کوئی ایسا مقصود منتہا ہو جو ایک مطلق قدر رکھتا ہو۔ جس کی طرف اپنی تمام کوششوں کو لے جانا "عمل خیر" قرار پا سکے اور تکمیلِ خودی یا انسانیت کے لئے جس تک پہنچنا ناگزیر ہو۔ چنانچہ برگساں اسی بنا پر یہ ماننے پر مجبور رہا ہے کہ:۔

"زندگی کی تمام تگ و تاز کا منشاء تخلیق نوعِ انسانی کی تکمیل ہے۔ یعنی انسانیت کو وہ کچھ بنا دینا جو کچھ وہ فی الفور بن جاتی اگر اسے اپنی شکل اختیار کر لینے میں انسانوں کی مدد درکار نہ ہوتی"۔[2]

انسان کو اس کی اپنی زندگی کا کوئی ایک بلند مقصود و منتہیٰ ہی ہر فکری و عملی گمراہیوں اور ہر قسم کے تلون و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستہ پر لگا سکتا ہے جس پر چل کر وہ تکمیل انسانیت کے مراحل طے کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسلام میں اخلاقِ انسانی کی اصل بنیاد سزا کا خوف نہیں سچائی کی محبت ہے۔

---

[1] اسرارِ خودی ص۶۳

[2] THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاقِ انسانی کے جتنے اصول و تقاضے بیان کئے جاتے ہیں جب تک وہ اپنے دل کی اعلیٰ ترین امنگیں نہ بن جائیں، دل و دماغ بدستور گنہگار رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگ اس گناہ کی زد سے بچ جائیں۔ اخلاقی تقاضے اسی وقت تک دل کی امنگیں بن سکتے ہیں جب کہ ہمیں اپنے حقیقی جذبات و احساسات کی پہچان ہو جائے۔ ہم اپنے اندرونی تضادات میں جو ہماری غفلت کی پیدائش ہیں، وحدت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اخلاقی مطالبات درحقیقت ہماری ہی فطرت کا اظہار ہیں۔ اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اصول ہے۔ وہ ہماری اندرونی زندگی کا قانون ہے۔ اخلاق کی محدود اور بوقلموں صورتوں کے پیچھے اسی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ صرف اسی کے ذریعہ انسان کی اندرونی زندگی میں توازن پیدا ہو سکتا ہے اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک اپنی اندرونی زندگی میں توازن نہ پیدا ہو جائے باہر کی زندگی میں کبھی بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اوسپنسکی OPUNSKEY لکھتا ہے کہ :-

"انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کرے، اسے اپنے آپ کو انا (EGO) کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے جس نے یہ وحدت قائم نہ کرلی ہو۔ وہ اگر اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔" ارادہ" تو نتیجہ ہوتا ہے خواہشات کا، جس شخص کی خواہشات مستقل نہ ہوں وہ محض اپنے جذبات اور خارجی اثرات کا کھلونا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کرے گا۔ اس کی زندگی کی ہر سانس اتفاقات کے پردوں میں گم ہوتی ہے"۔[1]

غرض داخلی توافق کے بغیر معاشرے میں کبھی توافق اور وحدت کی جلوہ گری ممکن نہیں۔ جہاں تک مطلق اخلاقی اقدار کے حصول و علم کا مسئلہ ہے، حقیقت کے علم کے بغیر اس قسم کے مطلق اخلاقی اقدار کا علم ممکن ہی نہیں۔ ایک مطلق اخلاقی قانون کو مادی اشیاء میں تلاش کرنا محال ہے۔ اخلاقی مرتبہ مادیت اور افادی نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ بلند ہے۔

اخلاق و کردار کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کا تسلسل حیات پر ایمان ہو وہ زندگی کو

---

[1] THE NEW MODEL OF UNIVERSE P 132 - 133

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستقل اور مسلسل سمجھتا ہو۔ مستقل اقدار سے اسی وقت انسانی سیرت کی تعمیر ہو سکتی ہے جب کہ انسان دائمی حیات کا قائل ہو۔

مختصر یہ کہ اقبال نے اخلاقی نظام کی اساس بھی قرآنِ حکیم پر ہی رکھی ہے۔ اس کے تصورات قرآنی احکام سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ انہیں قرآن کی تفسیر کہنا بے جا نہ ہوگا۔

سلسلۂ ارتقاء

سلسلۂ ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجِ حیات کی روانی میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ لیکن وہ ان تمام رکاوٹوں پر غالب آنے کے لئے ہر لمحہ بے قرار اور کوشاں ہے۔ عالمِ جمادات سے لے کر عالمِ حیوانات تک انہیں رکاوٹوں کا نام " مادّہ " ہے۔ لیکن انسان میں یہی مادہ باطل اور شر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی موجِ حیات یعنی حرکت انسانی وجود میں آکر حق اور نیکی سے موسوم ہوتی ہے چنانچہ اس روحانی ارتقاء میں ہمیں خیر و شر، حق و باطل، عدل و ظلم، محبت و عداوت، عقل و عشق، اور یزداں کے درمیان ایک پیہم کش مکش نظر آتی ہے۔ مردِ حق ان طاغوتی طاقتوں سے ہمیشہ برسرِ کار رہتا ہے۔

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ
بر خود افتد، ہمچو بر آہو پلنگ

علامہ فرماتے ہیں کہ شیطان کا وجود ایک سنگِ گراں ہے جو آدم اور یزداں کے درمیان حائل ہے لیکن اگر موجِ حیات یا حُسنِ عمل میں کافی طاقت ہے تو اس جمود و تعطّل کو توڑ سکتی ہے۔ وہی سنگ جو ہماری راہ میں حائل ہے شمشیرِ عمل کے لئے محض سنگِ فساں ہے۔ یعنی طاغوتی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے ہماری ملکوتی قوّتیں اور بھی تیز ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے علامہ فرماتے ہیں

تیغ و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

اس حق و باطل کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں راہنما کی حاجت ہے اور اقبال عشق کو بہترین راہنما قرار دیتے ہیں۔

علامہ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عشق "سلطان" است و برہان مبین
ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں[1]

اس شعر میں قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے۔

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطٰن۔

"اے گروہ جن وانسان کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکلو مگر بدوں زور کے نہیں نکل سکتے"۔

رُوحِ رومی علامہ کو اِلَّا بِسُلْطٰن کے معنی بیان کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ صحیح قسم کے علم کی قوّت سے انسان کا تصرف افلاک تک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ علم کے ذریعہ ہی مادی و روحانی اقدار کی تخلیق کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ کائنات کے دیر کہن میں لرزہ پیدا کرتا ہے ؎

جان بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ ہا افتد دریں دیرِ کہن![2]

یہ صاحب دل اپنی خودی کو عشق و محبت سے محکم کرکے نظامِ عالم کے قوائے ظاہر و مخفیہ کو مسخّر کرتے ہیں ؎

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل — اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں — کہاں حضور کی لذّت کہاں حجابِ دلیل[3]

ارتقائے انسانی کا منتہیٰ از روئے قرآن قربِ الٰہی ہے۔ واسجد واقترب (سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ)۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وان الیٰ ربک المنتہیٰ۔ تحقیق تیرا منتہیٰ تیرے خدا کی

---

[1] جاوید نامہ۔ ص ۱۸۱

[2] جاوید نامہ ص ۱۵

[3] بالِ جبریل ص ۹۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف ہے۔ (سورہ النجم آیہ ۴۲)

چنانچہ علامہ فرماتے ہیں ؎

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے ۔۔۔ سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد ۔۔۔ بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ اُمیدوارے

اقبال کے نزدیک بندۂ حق ہر حالت اور ہر مقام سے بے نیاز ہوگا۔ جاوید نامہ اقبال کے الفاظ ہیں۔

؎ بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام ۔۔۔ نے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ۔۔۔ ملک و آئینش خداداد است و بس

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں کائنات کی ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب محبت وعشق کی حرارت پیدا نہیں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے زندگی حرکت سے محروم اور غیر مکمل دکھائی دیتی تھی ؎

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے ۔۔۔ ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا ۔۔۔ نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دُنیا ۔۔۔ مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے[1]

آخر انسان نے عرشِ اعظم سے محبت کا تحفہ حاصل کیا۔ جس نے سکون کو حرکت میں اور سکوت کو رونق وہماہمی میں بدل دیا۔ قرآن کی رو سے کائنات کوئی ڈھلی ڈھلائی کل نہیں ہے۔ جس میں اب کسی نشوونما یا تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ عجب نہیں کہ اس کے وجود کی سب سے گہری تہ میں نئی پیدائش کی آرزو مخفی ہو ....

قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے وہ اسے آئندہ ایک اور پیدائش دے گا۔

یبدی اللہ الخلق ثم یعیدہ (سورہ العنکبوت آیہ ۱۹)

اس لئے کہ خدا خالقوں میں سب سے بہتر ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین

اسی بنا پر علامہ فرماتے ہیں :۔

---

[1] بانگِ درا صفحہ ۱۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

؎ گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

مختصر یہ کہ اقبال جہانِ تازہ کے خواہاں ہیں جس کی ارتقائی اہلیتیں موجودہ مشرق و مغرب کے مجموعی درجہ ارتقاء سے کہیں زیادہ ہوں چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ؎

بگزر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

قرآن مجید میں ہے کہ خدا تعالےٰ اپنی مخلوقات میں جو چاہے اضافہ کرتا ہے۔

یزید فی الخلق ما یشاء (سورہ فاطر آیہ ۱)

نبوّت

امام غزالی " المنقذ من الضلال" میں فرماتے ہیں کہ نبوت ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے اور جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ خاص چیزیں معلوم ہوتی ہیں جن سے عقل بالکل محروم ہے۔ بالفاظ دیگر نبی کو وہ علم دیا جاتا ہے جو دوسروں کے پاس نہیں ہوتا۔

یٰابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یاتک فاتبعونی اھدک صراطاً سویاً (۱۹، ۴۳)

ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

نبی خاک کو حیاتِ تازہ بخش دیتا ہے اور انسانوں کو خداوندانِ مجازی سے نجات دلا کر معبودِ حقیقی کا راستہ دکھاتا ہے۔ علامہ اس کی شان یوں بیان فرماتے ہیں۔

ذرّہ بے مایہ ضو گیرد ازو
ہر متاعے ارج کو گیرد ازو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگین زیک ساغر کند
نقشِ پایش خاک را بینا کند
ذرّہ را چشمک زنِ سینا کند

اس صاحب دل کے سوز سے قوم وجود میں آتی ہے ؂

فرد برمے خیزد از مشتِ گلے
قوم زاید از دلِ صاحبدلے (رموز ۱۳۶)

نبوّت کی فلسفیانہ حقیقت امام غزالی نے معارج القدس اور حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ نبوّت انسانیت کے رتبہ سے اس طرح بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہتا ہے وہ عطا کرتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نبی اپنے عمل کے اعجاز سے کائنات میں نئی زندگی پھونک دیتا ہے ؂

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل ۔۔۔ مے کند تجدید اندازِ عمل
جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او ۔۔۔ صد کلیم آوارہ سینائے او
زندگی را مے کند تفسیرِ نو
مے دہد ایں خواب را تعبیرِ نو (اسرار ۵۰)

علامہ فرماتے ہیں کہ وحی کی تعلیم انسانوں کو ایک معیار سے جانچتی ہے۔ اس کی تعلیم خودبیں نہیں ہوتی بلکہ سب کی بہبود کو مدنظر رکھتی ہے ؂

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر ۔۔۔ سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ ۔۔۔ در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ (جاویدنامہ ۸۷)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآنِ کریم میں یہی ارشاد ہوتا ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کی منفعت کے بڑے خواہشمند ہیں۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین

© rasailojaraid.com

رؤف رحیم۔ (۹ - ۱۲۸)

© rasailojaraid.com

(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں اور جن کو تمہارے نقصان کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں۔ بالخصوص ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں"۔

اقبال مقام سرکار دوعالم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

کجا نورے کہ غیر از قاصدے چیزے نمے داند
کجا خاکی کہ در آغوش دارد آسمانے را[1]

باوجِ مشتِ غبارے کجا رسد جبریل
بلند نامیٔ او از بلندیٔ بام است[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام تمام انسانیت کے لیے تھا۔ اس لئے فرمایا آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئے گا۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ط وکان اللہ بکل شیئٍ علیما (۳۳ - ۴۰)

"محمد تمہارے مردوں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے اختتام پر تشریف لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے"۔

یہاں اس سلسلۂ رشد و ہدایت کی تکمیل ہوگی جو انبیاء کرام کے ذریعہ شروع ہوئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (۵ - ۲)

"آج کے دن تمہارے لئے دین کو میں نے مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا"۔

اسی طرح بنی نوع انسان کے لئے خدا کی نعمتوں کا اتمام رحمۃ اللعالمین کے ذریعہ ہو گیا۔

نوعِ انسان را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ اللعالمین![3]

---

[1] زبورِ عجم صـ ۷۶ [2] زبورِ عجم صـ ۱۱۵ [3] رموز صـ ۱۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

لا نبی بعدی ز احسانِ خداست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوّت ازو — حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست — تا ابد اسلام را شیرازہ بست[1]

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ۔ جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

لیکن حقیقی اتباع محبت وعشق کے بغیر ممکن نہیں اس لئے مومن کے لئے عشق رسول ضروری ہے

حدیث شریف میں ہے۔

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین۔
یعنی جب تک اپنی اولاد اور دولت سے زیادہ حضور سے محبت نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوسکتا

اقبال نے اتباع رسول وعشق رسول پر بے حد زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

خاکِ یثرب کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر ؎
نفس گم کردہ مے آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

علامہ فرماتے ہیں سرکارِ دو عالم کا مقام ہر مسلمان کے دل میں ہے۔ جس شخص کے حریم دل میں آپ کا مقام نہیں وہ ایک ویران حبشی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ وہ مردہ ہے۔ قلب زندہ وہ ہے جو آپ کی محبت سے سرشار ہو۔ فرماتے ہیں ؎

© rasailojaraid.com

[1] رموز ص۱۱۸

© rasailojaraid.com

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است　　آبروئے مازنامِ مصطفےٰ است
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش　　تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش!
در شبستانِ حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید
درجہان آئینِ نو آغاز کرد　　مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد
ہمچو اُو بطنِ امِ گیتی نزاد![1]

علامہ اقبال کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم حضورؐ کی محبت میں جو اشعار آپ نے رقم کئے ہیں ان سے آپ کے دلی جذبات اور والہانہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار جو اقبال نے افغانستان سے واپسی پر قندھار میں حضورؐ کے خرقۂ مبارک کی زیارت کے بعد کہے ان کے پُرخلوص جذبات کا پتہ دیتے ہیں۔

؎ رقصد اندر سینہ از زورِ جنوں　　تا ز راہِ دیدہ مے آید بروں
آمد از پیراہنِ اُو بوئے اُو　　دادِ مارا نعرۂ اللہ ھُو[2]

اسی مناسبت سے قندھار کی مدح میں بھی آپ نے اشعار کہے ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

قندھار آں کشورِ مینو سواد　　اہلِ دل را خاکِ اُو خاکِ مراد
کوئے آں شہر است مارا کوئے دوست　　ساربان بربند محمل سوئے دوست
مے سرایم دیگر از یارانِ نجد　　از نوائے ناقہ را آرم بوجد
سینا است کہ فاران است یارب چہ مقام است ایں
ہر ذرہ خاکِ من چشمے است تماشا مست؟[3]

اس کے بعد خاکِ حجاز کی تعریف ملاحظہ ہو۔

؎ مقامِ عشق و مستی منزلِ اوست　　چہ آتش ہا کہ در آب و گلِ اوست
نوائے اُو بہ ہر دل سازگار است　　کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست
(ارمغانِ حجاز)

---

[1] اسرار و رموز صہ ۱۲۰　[2] مثنوی مسافر صہ ۴۱　[3] مسافر صہ ۳۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے رہرو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرّہ اُو درد مند است

باایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مُرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

بہ ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چندانکہ گوئی
بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است

وہ دانائے سُبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا!
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

آخر میں اقبال کی دُعا ملاحظہ ہو جو اس کے عشق رسول پر دلیل ناطق ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور تو می بینی حسابم ناگزیر!
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

© rasailojaraid.com